اکائی نمبر 31 : مجروحؔ سلطان پوری کی شاعری

ساخت

31.1 اغراض و مقاصد

31.2 تمہید

31.3 مجروح سلطان پوری کی شاعری کی شاعری

31.3.1 سوانحی خاکہ و شاعری

31.3.1 متن اور اس کی تشریح

31.4 آپ نے کیا سیکھا

31.5 اپنا امتحان خود لیجئے

31.6 فرہنگ

31.7 سوالوں کے جوابات

31.8 کتب برائے مطالعہ

31.1 اغراض و مقاصد

اس یونٹ کے ذریعہ آپ اردو کے ایک ممتاز شاعر مجروحؔ سلطانپوری کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں متعارف ہونگے اور آپ یہ جان سکیں گے کہ مجروحؔ کی شاعری کے امتیازات اور محاسن کیا ہیں۔ اور ان کو پڑھنا اور سمجھنا آپ کے لیے کیوں کر ضروری ہے۔

31.2 تمہید:

سوانح اور شخصیت

مجروحؔ سلطان پوری کا پورا نام اسرارحسن خاں تھا۔ وہ 1915 میں پیدا ہوئے۔ مجروحؔ کے اجداد راجپوت نسل سے تھے۔ ان کے والد محمد حسن خان پولیس میں ملازم تھے۔ گھر کے معاشی حالات بہت اچھے نہ تھے۔ ابتدا میں وہ ایک مکتب میں داخل ہوئے جہاں انھوں نے عربی فارسی اور اردو پڑھی۔ پھر وہ ایک عرصہ تک تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور 1933 میں طبیہ کالج لکھنومیں داخلہ لیا۔ 1938 میں کالج سے حکمت کی سند حاصل کر کے مجروح فیض آباد کے ٹانڈہ قصبے میں اپنا مطب قائم کیا اور حکمت چل پڑی۔ کچھ

عرصے بعد وہ سلطان پور واپس آ گئے۔ انھیں شروع سے ہی موسیقی سے دلچسپی تھی۔ انھوں نے لکھنؤ کے میوزک کالج میں داخل ہوکر موسیقی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ مجروحؔ کچھ عرصہ بیمار رہے، ممبئی میں علاج ہوا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا اور 24 مئی 2000، میں ان کا انتقال ہوگیا۔

عہد، سیاسی، سماجی، ادبی ماحول:

مجروحؔ کے بچپن میں خلافت تحریک شباب پر تھی۔ انگریزوں کے اقتدار کے خلاف پورے ملک میں گاندھی جی کی قیادت میں مہم جاری تھی۔ انگریزی کی پالیسی یہ تھی کہ مذہب اور نسل کی بنیاد پر ہندو مسلمان کو لڑایا جائے اور آپسی انتشار پیدا کیا جائے، اس میں ان کو کامیابی ملی۔ اب ملک میں دھیرے دھیرے مشترکہ تہذیب کی ضرورت اور اہمیت کا احساس ختم ہورہا تھا۔ آپسی جھگڑے اور فساد شروع ہوگئے تھے۔ کانگریس سیاسی پارٹی کے طور پر انگریزی حکومت کے خلاف سرگرم عمل تھی۔ پنڈت نہرو تمام صورت حال سے باخبر تھے اور تقریر و تحریر کے ذریعہ عملی طور پر ملک کی خدمت اور اصلاح کے کاموں میں شریک تھے۔ ہر طرف جہالت، تنگ نظری ذات پات غربت، افلاس اور بیماری کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ سماجی حالات بہت ابتر تھے۔

یہ وہی دور ہے جب ترقی پسند ادبی تحریک ہندستان میں بے حد مقبول ہورہی ہے۔ اردو کے اکثر شعرا اس تحریک سے وابستہ ہوکر سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کے بارے میں ادبی سطح پر اپنے افکار و خیالات ظاہر کررہے ہیں، اس عہد کے اہم شعرا میں جن لوگوں کا شمار ہوتا ہے۔ وہ ہیں:

اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، ن۔ م راشد، شاد عارفی، اختر انصاری، مخدوم محی الدین، فیض احمد فیض، اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی، علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، اور اختر الایمان وغیرہ فکشن لکھنے والوں میں اہم لوگوں کے کچھ نام اس طرح ہیں:

پریم چند، بیدی، منٹو، عصمت، قرۃ العین حیدر، احمد ندیم، قاسمی، کرشن چندر، سہیل عظیم آبادی اور حیات اللہ انصاری وغیرہ۔

شاعری کا ارتقا

مجروحؔ نے 1935 میں شاعری شروع کی۔ ان کی طبیعت کو شاعری سے گہرا لگاؤ تھا، سلطان پور میں پہلی غزل کہی اور ایک آل انڈیا مشاعرے میں شریک ہوئے اور غزل سنائی۔ انھوں نے محنت کرکے فن شعرا اور زبان و بیان پر قدرت حاصل کی اور بہت جلد اعتماد کے ساتھ شعر و سخن میں منہمک ہوگئے۔ ان کی ذہنی تربیت میں رشید احمد صدیقی اور جگر مرادآبادی کا بہت حصہ تھا۔

1945 میں مجروح ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے جگر صاحب کے ساتھ ممبئی گئے اور وہاں مشاعرے میں جب کلام سنایا تو فلم ڈائریکٹر کاردار جو وہاں موجود تھے وہ ان کے کلام سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے فلموں میں گانا لکھنے کے لیے مجروح کو راضی کرلیا۔ انھوں نے پہلی فلم ''شاہ جہاں'' کے گانے لکھے، نوشاد نے موسیقی اور سہگل پر یہ گانے فلمائے گئے جسے بے حد مقبولیت

ملی۔ مجروؔح نے فلموں کے لیے اردو اور بھوجپوری میں سینکڑوں گانے لکھے اور ان کے زیادہ تر گانے بے حد پسند کیے گئے۔ مجروؔح کی مقبولیت ایک ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے ہوئے لیکن وہ کلاسیکی شعری اقدار و روایات سے اس قدر متاثر تھے کہ برہنہ گفتاری اور خطابت ان کے بس کی بات نہ تھی۔ جو اس وقت ترقی پسند شاعر بننے کے لیے ضروری شرط تھی۔ بلکہ یہی صورت فیض کے ساتھ بھی تھی جن سے مجروؔح بہت متاثر تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کے بہت سے اشعار فیض کے انداز سے اتنے قریب ہیں کہ ان پر فیض کے اشعار ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے۔ بہر حال وہ غزل کے کلاسیکی رچاؤ اور ڈکشن کو چھوڑنے کے لیے راضی نہ ہوئے اور اسی کشمکش میں رہتے ہوئے انھوں نے شاعری کا سفر جاری رکھا انھوں نے انسانی زندگی اور اس کے مسائل، سے سروکار رکھا لیکن اپنی غزل کو نعرہ بازی سے بہت دور رکھا۔ ان کی اکثر غزلیں علی گڑھ کے زمانۂ قیام سے تعلق رکھتی ہیں۔ مجروح 1945 میں ترقی پسند تحریک میں شامل ہوئے جب کمیونسٹ تحریک اپنے شباب پر تھی، انھوں نے تمام عمر ترقی پسند رہنے کے باوجود، دیگر ترقی پسند شاعروں کی ڈگر سے الگ اپنی ایک الگ پہچان بنائی، مشاعروں اور فلموں کے سبب مجروؔح اردو کے بہت سے شاعروں سے کہیں زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل کی اور اس طرح غزل سرائی ان کے لیے تمام عمر کامیابی اور سرخروئی کا وسیلہ بنی رہی۔

اصناف وموضوعات

مجروؔح سلطان پوری کا سرمایہ سخن بہت مختصر ہے۔ ظاہر ہے فلمی گانے اس میں شامل نہیں ہیں۔ ان کی تمام تر شہرت کا دار و مدار دراصل ان کی خوبصورت غزلوں پر ہے، حالانکہ انھوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں جو تعداد میں مختصر ہیں۔

مجروؔح سلطان پوری کی غزلوں کا موضوع صحیح معنوں میں وہی ہے جو دیگر ترقی پسندوں کا ہے۔ یعنی استعماریت جاگیر دارانہ نظام، سیاسی وسماجی جبر کے خلاف سخت احتجاج اور ظلم و جبر کی تاریکیوں سے مسلسل لڑتے رہنے کا عزم محکم سماجی جبر وتشدد، نا انصافی اور طبقاتی کشمکش کے سلسلے میں ان کا ذہنی اور جذباتی ردعمل ان کی بیشتر غزلوں میں نظر آتا ہے۔ تاہم غزل کا بنیادی موضوع یعنی حسن وعشق بھی ان کی غزلوں سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ مجروؔح کی بنیادی توجہ اور فکر کا موضوع سماجی زندگی کا خلفشار ہی کہا جاسکتا ہے جس میں حسن وعشق کی حیثیت ثانوی وضمنی ہوجاتی ہے

شعری محاسن اور امتیازات

اگر کہ کہا جائے کہ جدید اردو شاعری کی تاریخ میں مجروؔح کی حیثیت ایک رجحان ساز تخلیق کار کی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ انھوں ن غزل کی کلاسیکی روایات و اقدار کی پاسداری اور اس صنف کو اپنے عہد کی حسیت اور تبدیل ہوتے ہوئے مزاج کا آئینہ دار بنایا۔ وہ ترقی پسندوں میں سب سے بڑے غزل گوتسلیم کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے غزلیہ شاعری کو نئی سمت اور منزل کا شعور عطا کیا۔ ان کے اشعار کا لہجہ غنائی شاعری کے مزاج سے گہری مناسبت رکھتا ہے۔ یہاں مدھم سروں میں پیام زیر لبی ہے ان کے لہجے کا ٹھہراؤ، توازن اور سنبھلی ہوئی جذبے اور فکر میں تحلیل ہوگئی ہے۔ انسان دوستی، احترام آدمیت اور دردمندی کے جذبات تطہر شدہ اور رچے ہوئے انداز میں ظاہر ہوتے ہیں۔ علامتی زبان، غزل سے منسوب تلازمات و انسلاکات کے جلو میں بڑی دلکشی اور

معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہ غزلیں کلاسیکیت کے آب و رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں اور ان میں غزل کی تہذیب رچ بس گئی ہے۔ مجروح نے ترقی پسند نظریات کو اپنی شرائط پر قبول کیا۔ انھوں نے اپنی غزلوں کو برہنہ گفتاری اور سپاٹ اندازِ بیان سے بچائے رکھا اور اس کی فنی حرمت پر حرف نہیں آنے دیا۔ وہ ایک زبردست فنکار اور جمالیاتی حس کے مالک منفرد اور ممتاز شاعر ہیں جن کی شاعری میں وہ سب کچھ ہے جو ایک اعلا پائے کے شعری وتخلیقی تجربے کا امتیاز و افتخار ہے۔ انھوں نے بہت سی شعری تراکیب اور استعارے واقعات کربلا سے حاصل کیے جو ان کی مذہبی حسیت اور فنکاری کی دلیل ہے۔ ان کے کلام میں لذت بخش موسیقیت اور ترنم کانوں میں رس گھول دیتا ہے۔ سننے والا بے قرار ہوجاتا ہے۔ یہ کسی بھی شاعری کا معمولی وصف نہیں کہ اس کو پڑھنے سے سماعت اور بصارت دونوں کو آسودگی حاصل ہوتی ہے۔

تصانیف

مجروحؔ کی تصانیف کی تعداد بہت کم ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے فلمی زندگی سے وابستگی کے سبب غزل کی طرف توجہ کم کی۔ ان کے صرف تین شعری مجموعے شائع ہوئے۔

(1) غزل　　(2) مشعلِ جاں　　(3) تماشائی

ادب میں مقام

یہ اہم بات ہے کہ گرچہ مجروحؔ نے مقدار کے لحاظ سے بہت کم شعر کہے۔ یعنی اردو دیگر شعرا، کے مقابلے میں ان کا سرمایۂ شعر بہت ہی مختصر ہے۔ اس کے باوجود بھی جو کچھ ہے وہ منتخب ہے اور اس کی شاعر کی بصیرت اور مشاہدے کی قوت اس کے تخلیقی مزاج سے مَس ہوکر لازوال ہوگیا ہے۔ مجروح نے بات کرنے کا سلیقہ حسنِ ادا، ترسیل کی دلکشی، فکر کی صلابت اور تجربے کو احساس کی آگ میں تپانے کا انداز، رمز وکنایے کی کارگزاری اور انسانی درد سے رشتے استوار کرنے کا عزم محکم، مجروحؔ کا مقام بیسویں صدی کے غزل گو شعرا، کی صف اول میں جگہ دلاتا ہے۔ اردو غزل کا وہ کارواں جس میں اصغر، حسرت، فانی، جگر نے اپنے سخن کی شمعیں روشن کر رکھی تھیں، مجروح کے لیے اس بزم میں نئی روشنی لے کر آنا۔ غزل کے مزاج، مذاق وآہنگ، بانکپن اور دلداری کا بھرم قائم رکھنا کس قدر مشکل رہا ہوگا۔ پھر مجروحؔ نے قدم جمائے رکھا اور وقت کی تیز آندھیاں بھی ان کے روشن کیے ہوئے تخلیقی چراغ نہ بجھا سکیں۔

31.3 متن اور اس کی تشریح

غزل (1)

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

دیارِ شام نہیں منزل سحر بھی نہیں
عجیب نگر ہے یہاں دن چلے نہ رات چلے

ہوا اسیر کوئی ہم نوا تو دور تلک
بہ پاس طرز نوا ہم بھی ساتھ ساتھ چلے

ہمارے لب نہ سہی. وہ دہانِ زخم سہی
وہیں پہنچی ہے یارو کہیں سے بات چلے

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

بچاکے لائے ہم اے یار پھر بھی نقد وفا
اگرچہ لٹتے ہوئے رہزنوں کے ساتھ چلے

پھر آئی فصل کی مانند برگ آوارہ
ہمارے نام گلوں کے مراسلات چلے

غزل (1)

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوائے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا تو چراغ راہ میں جل گئے

وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمہ میں ڈھل گئی
وہی لب جنھیں نہ میں چھو سکا قدحِ شراب میں ڈھل گئے

وہی آستاں ہے وہی جبیں وہی اشک ہے وہی آستیں
دلِ زار تو بھی بدل کہیں کہ جہاں کے طور بدل گئے

تجھے چشم مست پتا بھی ہے کہ شباب گرمیٔ بزم ہے

تجھے چشم مست خبر بھی ہے کہ سب آبگینے پگھل گئے

مرے کام آگئیں آخرش یہی کاوشیں یہی گردشیں
بڑھیں اس طرح مری منزلیں کہ قدم کے خار نکل گئے

غزل (3)

جب ہوا عرفاں تو غم آرام جاں بنتا گیا
سوزِ جاناں دل میں سوز دیگراں بنتا گیا

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسم چمن
دھیرے دھیرے نغمہ دل بھی فغاں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

میں تو جب مانوں کہ بھردے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیرمغاں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

شرح غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضمون کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

تشریح:

غزل (1)

اردو کے معروف شاعر مجروحؔ سلطان پوری ہمارے عہد کے ان شاعروں میں ہیں جن کی پہچان ترقی پسند فکر سے ہوتی ہے۔ مجروحؔ بے شک نظریات و خیالات کی حد تک ترقی پسند ہیں لیکن وہ ہماری نوکلاسیکی غزل کے بھی نمائندہ شاعر ہیں جنھوں نے روایت سے

قطع تعلق کیے بغیر جدید زندگی اور اس کے مسائل کو بہت خوبصورت شاعرانہ پیرائے میں پیش کیا ہے۔ ان موجودہ غزل مذکورہ خصوصیات کی نہایت دلنشیں مثال ہے۔

پہلے شعر جلا کے مشعل جاں............ میں یہ بتایا جارہا ہے کہ ہم لوگ (یعنی شعراء) اور بلند انسانی آدرش رکھنے والے لوگ اب اپنی جانوں یا خون سے جلائی گئی مشعل یعنی شمع ہاتھ میں لے کر نکل چکے ہیں۔ ہم لوگ جنوں صفات یعنی متوالے اور دھن میں مگن ہیں۔ ہمیں صرف ایسا مقصد عزیز ہے۔ دوسرے مصرعے میں کہتے ہیں کہ جو گھر کو آگ لگائے بمعنی جو اپنا گھر بار عزیز اقارب کو چھوڑ نے کا حوصلہ رکھتا ہو وہ ہمارے ساتھ آجائے۔

دوسرے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ ہم جس منزل کی طرف جارہے ہیں اس تک پہونچنے کے لیے نہ رات شرط ہے نہ دن۔ ہم کب واں پہونچیں گے اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ یہ وہ رہگزر ہے جہاں ہم کو نہ رات کی فکر ہے اور نہ دن کی فکر ہے تو صرف مقصد زندگی کی اور منزل تک پہنچنے کی ہے۔

تیسرے شعر میں شاعر کا کہنا ہے کہ ہمارے ساتھیوں میں اگر کوئی پکڑ لیا گیا یا دشمنوں نے گرفتار کرلیا تو ہم اس کی حمایت اور مدد کے لیے چل پڑے، ہم کبھی دوستی کی راہ میں پیچھے نہیں ہٹے۔

چوتھے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ بات اگر اہم ہے تو وہ ہمارے لبوں سے نکلے یا زخم خوردہ انسان کے منہ سے نکلے اس کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ بات کہیں سے بھی نکلتی ہو، بات بالآخر محبوب تک پہنچ ہی جاتی ہے۔

پانچویں بے حد خوبصورت شعر میں ستون دار، یعنی پھانسی کے تختوں پر جہاں تک بھی یہ ہوں، ان پر اپنے کٹے ہوئے سروں کے چراغ رکھتے چلو تا کہ ستم یعنی ظلم اور تاریکی کی رات میں کچھ تو اجالا ہو۔ یہ شعر ظلم کے خلاف بڑا موثر احتجاج ہے۔

چھٹے شعر میں بھی شاعر کہتا ہے کہ وفاداری بہت قیمتی شے ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کی حفاظت کی ہے۔ راہزن، ڈاکو اس قیمتی شے کو لوٹنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ان کا مقابلہ کرتا رہا اور قیمتی شے بچا کر لے آیا۔

آخری شعر میں شاعر اپنے محبوب کی جانب اور اپنے عشق کے حوالے سے کہہ رہا ہے کہ آوارہ بتوں کے اڑنے کا موسم پھر آ گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ گلوں، یعنی حسین چہرہ رکھنے والوں نے مجھے یاد کیا ہے۔ مجھ سے خط و کتابت کرنا چاہتے ہیں۔

غزل (2)

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں.................

نہایت خوبصورت نسبتاً طویل بحر میں لکھی گئی غزل ہے۔ یہاں پہلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ میرے لیے زندگی کے کٹھن راستے بہت آسان ہوگئے اور ہوا کا رخ بالکل بدل گیا۔ اس لیے کہ میرے ہاتھ میں میرے حسین ساتھی میرے محبوب کا ہاتھ آ گیا تو میرے اندر اتنی طاقت آ گئی کہ اب کوئی بھی مشکل میرے لیے مشکل نہیں رہی۔ تاریک راستوں میں چراغ جل اٹھے۔

دوسرا شعر بھی کافی رومانی انداز لیے ہوئے ہے۔ میرے سوال محبت پر وہ اس قدر لجائے کہ سر نہ اٹھا سکے اور ان کے چہروں پر ان کی حسین زلفیں اس طرح اچانک اڑنیں لگیں کہ گذشتہ رات کی کہانی نظروں میں تازہ ہوگئی۔

تیسرے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ وہ لفظ محبت جو میرے لب پر آتے آتے رہ گیا۔ وہ میرے اشعار میں ڈھل گیا ہے، میری شاعری سرتا سر محبت بن گئی ہے۔ اور محبوب کے وہ لب جنھیں چھونے کی حسرت ہی رہ گئی، میرے شراب تک پہونچنے کا سبب بن گئے۔

چوتھے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ رہ و رسم عاشقی صدیوں سے نہیں بدلا ہے۔ عشق میں آج بھی محبوب سے وہی فاصلہ۔ وہی کلفتیں، وہی آنسو بہانے کا انداز اب تک چلا آرہاہے۔ زمانہ تو اب کافی تبدیل ہوچکا ہے اب رسم عاشقی بھی بدل جائے تو کتنا اچھا ہو پانچویں شعر میں شاعرمحبوب سے کہتا ہے کہ جوانی گرمی بزم کا نام ہے محفل میں آنے سے رونق بڑھتی ہے۔ جوانی کی مستی چاہنے والوں کا تقاضا کرتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں بڑی خوبصورت بات کہتا ہے۔ یعنی محبوب کی چشم مست کی گرمی کی کون تاب لاسکتا ہے، یہ نگاہ جس پر بھی پڑھی وہ آبگینے کی طرح پگھلتا چلا گیا۔اس کے ہوش اڑ گئے۔ بے خود ہوگیا۔

آخری شعر میں شاعر کہتا ہے کہ میرے حرکت وعمل سے مجھے فائدہ پہنچا۔ میری گردشیں میرے لیے بہت مفید ثابت ہوئیں منزلیں چونکہ دور ہوتی چلی گئیں اس لیے مجھے وہاں تک پہونچنے کے لیے بہت زیادہ چلنا پڑا۔ میرے پیروں میں چبھتے ہوئے کانٹے خود بخود اس طویل سفر میں میرے پیروں سے نکل گئے۔

غزل (3)

تیسری غزل سے پہلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ غم کی قیمت کا جب اندازہ ہوا تو یہی غم زندگی میں قرار کا سبب بن گیا سوز جاناں سے آشنا ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ دوسروں کے غم کی کیا شدت ہوتی ہے۔ اس کا احساس پیدا ہوا۔ اگر محبت میں اس سوز اور تڑپ سے سابقہ نہ پڑتا تو دوسروں کے دکھوں کا اندازہ کیسے ہوپاتا۔

دوسرے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا بھی عجب جگہ ہے، یہاں ہر چیز بدل جاتی ہے۔ رسم چمن بھی بدل جاتی ہے، حد یہ ہے کہ اب دل سے نکلنے والا نغمہ بھی خوشی کا نغمہ نہیں رہا ہے، یہ آہ فغاں میں تبدیل ہوچکا ہے۔

تیسرے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ آدمی اگر ٹھان لے کہ اسے کوئی مشکل کام کرنا ہے اور وہ ہمت سے کام لے کر اس کٹھن کام کو کرنا شروع کردے تو پھر لوگ اس کے ہمنوا ہوجاتے ہیں۔ اس طرح سے لوگ ساتھ میں آتے رہتے ہیں۔ کارواں تیار ہوجاتا ہے، پھر منزل تک کچھ دشوار نہیں رہتا۔

چوتھے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ فراخ دلی اور کشادہ قلبی تو یہ ہے کہ جو صاحب مال و زر ہو وہ تمام ضرورت مندوں کی طرف ملتفت ہو سب کے خالی جام کو بھر دے، ورنہ یوں تو اس دنیا میں بڑے بڑے صاحب حیثیت ہیں، پیر فغاں لیکن وہ کچھ قاصر لوگوں کے ہی پیالۂ شراب کو بھرنا پسند کرتے ہیں۔

پانچویں شعر میں شاعر خود کو ان محبت کرنے والوں میں شامل کرتا ہے جن کے تلوے چھالوں سے پر نہیں تاہم وہ کہتا ہے کہ ہم جو محبت میں پیر کے چھالوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ اس طرح اس راہ میں آگے بڑھتے ہیں کہ کانٹے ہمارے لیے پھول بن جاتے ہیں اور پھول گلستان میں تبدیل ہوجاتے ہین۔ ہمارے شوق کے آگے تمام رکاوٹیں خود بخود ہٹتی چلی جاتی ہیں۔

چھٹے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے حضور میں اس کے دیے ہوئے غموں کی شکایت بھی پوری طرح درج نہ کراسکا۔ حد یہ ہے کہ جو کہہ بھی نہ سکا اس کے اتنے مطلب نکالے گئے کہ پوری داستان بن گئی۔ یہ ہماری قسمت ہے۔

ساتویں شعر میں شاعر اپنے شاعرانہ کمالات اور تخلیقی ہنر مندی پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی مضمون چاہے وہ عشق ہی کیوں نہ ہو، اس میں لافانی عنصر کہاں ہے، یہ تو میری شاعری کا کمال ہے کہ اس جادو کی چھڑی سے میں جو بھی مضمون چھولیتا ہوں وہ امر ہوجاتا ہے۔

31.4 آپ نے کیا سیکھا:

1۔ مجروح کے حالات زندگی اور ان کی ذہنی تربیت کے بارے میں جانکاری حاصل کی؟

2۔ مجروح کے فکر دفن اور ہم عصروں کے کلام سے واقف ہوئے۔

3۔ مجروح کی تین غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا۔

4۔ مجروح کے کلام کی قدر و قیمت متعین کی۔

31.5 اپنا امتحان خود لیجیے:

1۔ مجروحؔ کی ترقی پسندی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

2۔ مجروحؔ کی شاعری کے موضوعات کیا ہیں؟

3۔ مجروحؔ کی شاعری کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟

4۔ مجروحؔ کی شاعری آپ کو کیوں متاثر کرتی ہے؟

5۔ ادبی تاریخ میں مجروحؔ کا کیا مقام ہے؟

31.6 فرہنگ:

مشعل = قندیل، شمع

جنوں صفات	=	پاگل، دیوانے
دیار	=	جگہ
سحر	=	صبح
اسیر	=	گرفتار
ہم نوا	=	ساتھی
پہ پاس	=	خیال کرنا
نوا	=	آواز
دہان	=	منہ
ستون	=	کھمبے
دار	=	پھانسی
ستم	=	ظلم
رہزن	=	لٹیرے
برگ	=	پتلہ
گل	=	پھول
مراسلات	=	خط، کتابت
قدح	=	پیالہ
جبیں	=	ماتھا
آستانہ	=	بزرگ یا محبوب کا گھر
اشک	=	آنسو
طور	=	طریقہ
چشم	=	آنکھ
شباب	=	جوانی
آبگینے	=	بلبلے
کاوش	=	محنت،کوشش
خار	=	کانٹا
عرفان	=	واقفیت
سوز	=	جلن

منقلب	=	تبدیل
فغاں	=	رونا، چلانا
پیر مغاں	=	شراب خانے کا مالک
آبلہ پایان شوق	=	محبت میں پھپھولے سے چھلنی پیر
شرح	=	تشریح
جاوداں	=	ہمیشگی، ہمیشہ رہنے والا

31.7 سوالوں کے جوابات :

1۔ مجروحؔ نے 36-1935 کے قریب ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ ہوئے لیکن وہ اس طرح وابستہ ہوئے کہ تمام زندگی طعن و تنقید کا نشانہ بنتے رہنے کے باوجود تحریک سے وفاداری میں فرق نہیں آنے دیا۔ مجروحؔ چونکہ کلاسیکی روایات و اقدار کے دلدادہ تھے حسن پرستی ان کا شیوہ تھا۔ زبان و بیان کا ایک خاص مذاق رکھتے تھے۔ چنانچہ شروع کے دور میں عام طور پر جس طرح ترقی پسند نام نہاد شعرا، برہنہ گفتاری اور خطیبانہ انداز میں سماجی خرابیوں پر طنز کرتے تھے اور اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے تھے وہ طریقۂ کار چونکہ شاعری کے آداب اور فنی مطالبات کے کوسوں دور تھا، جبکہ مجروحؔ ایک پختہ کار سلجھے ہوئے اور سچا فنی و جمالیاتی شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے شاعری میں سطحیت کو ہرگز نہیں پسند کیا اور جو کچھ بھی سماجی، سیاسی احتجاجی رقم کیا وہ شاعرانہ زبان میں رقم کیا جو غیر معمولی طور پر شاعرانہ اور تخلیقی آداب و رسوم کی پابند تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند نقاد انھیں خاطر میں نہیں لاتے تھے اور جدید نقاد ان کی ترقی پسندی کے سبب ان سے ناخوش رہتے تھے۔ پھر بھی وہ اپنے ارادے میں کبھی ضعف کے شکار نہیں ہوئے، تمام عمر وہ ترقی پسند فکر اور ترقی پسند مسلک پر کاربند رہے۔

2۔ مجروحؔ نے چونکہ غزل کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، جس میں بات کہنے کی ایک ہی جائز صورت ہے یعنی رمزیت اور ایمائیت، اس لیے انھوں نے جو کچھ بھی کہا اور جن خیالات کا بھی اظہار کیا ڈھکے چھپے انداز میں ہی کہا۔ غزل کی اس حد بندی کے اندر انھوں نے عشقیہ جذبات و احساسات کی بھی مصوریؔ کی اور نہایت موثر اور دلکش پیرایے میں کی لیکن ان کے محبوب موضوعات تو وہی تھے جو عام طور پر سبھی ترقی پسند شعرا کے رہے ہیں۔ یعنی سماجی زندگی اور اجتماعی المیے، طبقاتی کشمکش، جاگیردارانہ ذہنیت، تشدد، بربریت، ظلم و فساد اور سماجی زندگی کے وہ تمام مسائل جن کا تعلق بے روزگاری، غربت، جہالت، تنگ نظری، تعصب، حرص و ہوس کمزوروں خصوصاً عورتوں پر ظلم و زیادتی کے خلاف ہمیشہ جہاد کیا اور مزدوروں اور کسانوں کو حوصلہ دیا۔ ان کے درد سے رشتے استوار کیا۔

3۔ مجروحؔ کی غزل اردو کلاسیکی روایات و اقدار کی امین ہوتے ہوئے اپنے عہد کے درد و داغ اور سوز و ساز کی نہایت موثر ترجمان ہے اپنے زمانے کے تبدیل ہوئے سیاسی، سماجی، تہذیبی منظر نامے کو اپنی فکر کا موضوع بنایا اور قدامت کو ذہنی

پسماندگی اور کم ہمتی سے تعبیر کیا۔ انھوں نے ترقی پسند شاعری کو نئی سمت و رفتار ذائقے اور رنگت سے آشنا کیا۔ ان کا مدھم، نرم، شیریں اور تمنائی لہجہ اس قدر دلنشیں ہے کہ آج بھی اس کی قربت سے رفاقت کی خوشبوں آتی ہے۔ ٹھہراؤ، نفاست، توازن اور ایک ٹھہراؤ ان کے منفرد مزاج اور شاعرانہ شخصیت کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ وہ شاعری ہے جس کو پڑھنے سے بصارت اور سماعت دونوں کو لذت اور تازگی حاصل ہوتی ہے۔

4۔ مجروحؔ کی شاعری اس لیے متاثر کرتی کہ وہ کسی عہد کے مسائل کی اسیر نہیں ہے۔ اس فکر میں ٹھہراؤ نہیں تحرک اور آفاقیت ہے انھوں نے ترقی پسند نظریات کو اپنی شرائط پر قبول کیا۔ اپنی غزلوں کو برہنہ گفتاری، خطابت اور وقتی مسائل کی ترجمانی تک محدود نہ رکھا اسے ایک بڑے اور اہم سماجی، تہذیبی اور جمالیاتی مقصد کا ترجمان بنایا۔ اس شاعری میں وہ سب کچھ ہے جو ایک اعلا پائے کے شعری و تخلیقی تجربے کا امتیاز و افتخار ہے انھوں نے اپنے عہد کی ہزیمتوں کی داستان رقم کرنے کے لیے کربلائے معلیٰ کے خوں چکاں واقعات کی علامتی و استعاراتی معنویت سے بھی خوب خوب استفادہ کیا ہے۔

شعر و ادب کی تاریخ میں مجروحؔ اپنے تخلیقی کارناموں، روشن فکر جمالیاتی نقطۂ نگاہ اور گہری انسانی بصیرتوں کے لیے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ مجروحؔ کا انداز گویائی حسن ادا، ترسیل کی دلکشی و لطافت، فکر کی صلابت اور تجربے کو احساس کی آگ میں تپانے کا انداز، رمز و کنایے کی کارگزاریاں، وہ اوصاف و محاسن ہیں جنھیں رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا اور غزل جب تک باقی ہے مجروح کا نام بھی اردو کے نامور شعرا اقبال، فیض، اصغر، جگر، فانی، حسرت اور فراق کے ساتھ لافانی رہے گا۔

5۔ مجروحؔ کے صرف 3 شعری مجموعے شائع ہوئے۔ وہ اس طرح ہیں

(1) غزل (2) مشعلِ جاں (3) تماشائی

31.8 کتب برائے مطالعہ

1۔ غزل — مجروحؔ

2۔ مشعلِ جاں — مجروحؔ

3۔ گلکاریٔ وحشت کا شاعر — مرتبہ خلیق انجم

4۔ مجروح: مقام اور کلام — ڈاکٹر محمد فیروز

5۔ تاریخ ادب اردو — پروفیسر وہاب اشرفی